محمد حنیف ندوی

غزالی کی مشہور کتاب
"المنقذ من الضلال"
کی تلخیص

غزالی کی سرگزشتِ انقلاب

(۲)

متلاشیانِ حق کی قسمیں

جب زبان بندی کی اس اُلجھن سے میں نے چھٹکارا پایا، تو میں نے دیکھا، کہ متلاشیانِ حق کی چار قسمیں ہیں:

(۱) متکلمین۔ یہ وہ گروہ ہے جو اپنے کو اہل الرائے یا اہل النظر کہتا ہے۔

(۲) باطنیہ۔ یہ جماعت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اصحاب التعلیم کے نام سے پکارے جاتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں، کہ صرف امام معصوم ہی سے انوار و معارف کا اکتساب ممکن ہے۔ گویا علم و حقیقت کی تلقین کا ذریعہ صرف تعلیم ہے۔

(۳) فلسفی۔ یہ منطق و برہان کا شکار ہیں۔

(۴) صوفیاء۔ ان کا دعوے یہ ہے، کہ یہ مقربانِ خاص ہیں، اور مشاہدہ و مکاشفہ سے براہِ راست بہرہ مند ہیں۔

جب میں نے ان چار قسموں پر غور کیا تو دل میں کہا، کہ حق و صداقت کی راہ ان چار ہی میں منحصر ہوگی، ان سے باہر سچائی کا امکان نہیں؛ انہیں میں وہ لوگ پائے جا سکتے ہیں، جنھیں حقیقت کی تلاش و جستجو کا جذبہ کارفرما ہے، اگر ان گروہوں کا دامن حق صداقت کی طلب و یافت سے تہی رہا، تو پھر اس کو پالینے کا موقع اور کہاں میسّر آسکتا ہے؟ میں اس لئے بھی، حق و صداقت کو ان چاروں میں منحصر سمجھنے پر مجبور تھا، کہ اب اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟ تقلید جو پہلے تسکین و طمانیت کا موجب تھی، اب اس کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا، اور پھر دوبارہ اس کی طرف رجوع کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔ یوں بھی مقلد اسی وقت تک اس پر قناعت اختیار کر سکتا ہے، جب یہ نہ جاننے پائے، کہ اس کا سررشتہ اطمینان تقلید و اطاعت سے وابستہ ہے، اگر اس نے اس حقیقت کو پالیا، اور یہ جان لیا، کہ میں مقلد ہوں تو اس کے عقائد کا یہ نازک آبگینہ یکسر ٹوٹ گیا۔ اور ایسا ٹوٹا کہ پھر ملانے اور ترتیب دینے سے نہیں جُڑتا، تا آنکہ اس کو از سرِ نو آگ میں ڈال کر گلایا، اور بنایا نہ جائے۔

یہ سوچ کر میں نے طے کیا، کہ ان چاروں فرقوں کے عقائد کی چھان بین کرنا چاہئے، اور ان کی راہ پر چند قدم چل کر دیکھنا چاہئے۔ کہ ان کے پاس کیا کچھ ہے، چنانچہ اس اثناء میں میری تحقیقات نے جن نتائج پر پہنچایا، اس کو میں علی الترتیب بیان کرتا ہوں، ابتداء علم الکلام سے ہوگی، اس کے بعد فلسفہ و حکمت پر گفتگو آئے گی، پھر تعلیمات باطنیہ سے متعلق کچھ کہا جائے گا، اور آخر میں یہ بتایا جائیگا کہ صوفیاء کے افکار و احوال کی کیا نوعیت ہے؟

علم الکلام (اس کے مقصود و حاصل پر تنقید)

علم الکلام سے نفسِ فن کا مقصد تو پورا ہوتا ہے، مگر میرے شک کی بیماری دُور نہیں ہوتی

سب سے پہلے میں نے، اپنی تحقیق و تفحص کا ہدف علم الکلام کو ٹھہرایا۔ اس کو خوب خوب پڑھا، اور اس کے مطالب و معانی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اچھی خاصی محنت کی۔ اس فن کے محققین نے جو کچھ تحریر کیا ہے، اس کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا، بلکہ خود بھی اس کی تفصیلات و جزئیات پر کئی کتابیں لکھ ڈالیں۔ اس علم سے متعلق میری یہ جچی تلی رائے ہے، کہ اس سے نفسِ فن کا مقصد تو بلاشبہ پورا ہوتا ہے، لیکن شک و ریب کی وہ بیماری جو میرے دل میں پیدا ہوگئی تھی، اس کا کوئی مداوا اس میں مذکور نہیں۔

اس کا مقصد و حاصل کیا ہے؟ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ اہلِ بدعت نے فکر و عقیدہ کی جن گمراہیوں کو پھیلا رکھا ہے، اہل السنّت کو ان سے بچانا اور محفوظ رکھنا۔ یہ فن کیونکر معرضِ ظہور میں آیا؟ اس کی ایک مختصر تاریخ ہے۔ ہُوا یوں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کی وساطت سے، اپنے بندوں کو عقیدہ برحق سکھایا جس پر کہ دین و دنیا کی کامرانیاں منحصر تھیں۔ جیسا کہ قرآن حکیم اور احادیث سے ظاہر ہے۔ پھر شیطان نے لوگوں کے دلوں میں ایسی وسوسہ اندازی کی۔ اور ایسی ایسی بدعات کو رواج دیا۔ کہ جو عقیدہ اہل السنّت کے ساتھ کوئی مناسبت نہ رکھتی تھیں۔ شیطان کے ان مریدانِ باصفا نے، اس زور سے ان مبتدعانہ عقائد کو پیش کیا کہ جس سے یہ خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ کہیں سیدھے سادے عقائد اہل السنت میں فی الواقع تشویش اور گڑبڑ نہ آ بھر آئے۔ اور قریب تھا کہ ان کے فکر و عقید کو جنبش آئے، کہ اللہ نے متکلمین کے گروہ کو ان کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ اور ان کے دلوں میں نصرتِ دین اور تائید اسلام کے داعیہ کو بیدار کیا۔ انہوں نے نہایت عمدگی اور ترتیب سے، اہلِ بدعت کی تردید کی۔ اور واشگاف طور پر بتایا، کہ ان کے پائے استدلال نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے، اور یہ کہ بدعت کیا ہے، اور سنت ماثورہ کسے کہتے ہیں؟ اس طریق دفاع و مناظرہ سے علم الکلام پیدا ہُوا۔ الحق یہ ہے، کہ ان میں کے ایک گروہ نے، بڑی کامیابی سے اس غرض کو پورا کیا، جس کو پورا کرنے کے لئے، یہ پیدا ہوئے تھے۔ یعنی سنت کی پوری پوری مدافعت کی، اس عقیدہ و فکر کی حفاظت میں جان توڑ کوشش کی، جس کو کہ حضرت نبوّت سے پایا تھا، اور اہلِ بدعت کے ہر ہر اعتراض کا شافی جواب دیا۔

متکلمین نے فکر و استدلال کے جن حربوں کو استعمال کیا انہیں کوئی جدّت نہ تھی، بلکہ وہ تو انہیں کے مسلّمات تھے جن کو انہیں پر پلٹ دیا گیا۔

لیکن بایں کامرانی ان کے طریقِ استدلال اور طریقِ بحث و مناظرہ میں، ایک نقص تھا اور وہ یہ تھا کہ یہ زیادہ تر انہیں مقدمات و براہین پر اعتماد کرتے تھے، جن کو ان کے خصم پیش کرتے تھے۔ ان کا معروف انداز اس سلسلہ میں یہ تھا، کہ یہ اکثر انہیں مسلّمات کو مخالفین کے خلاف استعمال کرتے جن کو وہ رد نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ایسا کیوں کرتے تھے؟ اور ان کی کیا مجبوریاں تھیں!

اس کا جواب یہ ہے، کہ یا تو تقلید کے سبب ایسا ہوتا، یا اس بنا پر کہ یہ اجماعِ اُمت سے باہر نہیں ہونا چاہتے تھے، اور یا قرآن و حدیث کی تصریحات ان کو ان مسلّمات و مقدمات کو تسلیم کرنے پر آمادہ کرتیں۔ بہرحال یہ طریقِ استدلال ایسا تھا، جو اس شخص کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا تھا، جو سوا ضروریات کے اور کوئی چیز مانتا ہی نہ ہو۔ اور بالخصوص میری

بیماری کا تو اس سے قطعی ازالہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اس میں حقائق امور سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا تھا۔ ہاں یہ صحیح ہے، کہ اوّل اوّل جب علم الکلام کا رواج ہوا، تو بحث و مناظرہ کے ضمن میں، ایسی بحثیں بھی آئیں، جن کا تعلق حقائق اشیاء سے ہو سکتا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ متکلمین نے جواہر اعراض کے بارہ میں، لب کشائی کی، لیکن یہ بحثیں چونکہ اصلاً ان کے حیطۂ بحث سے خارج تھیں، اس لئے ان پر کماحقہٗ غور نہیں ہو سکا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کی تحریروں میں، وہ بات نہیں پیدا ہو سکی، جس سے کہ حیرت و ارتیاب کے دل یا دل چھٹ جائیں۔ اور حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔ میں یہ نہیں کہتا، کہ میرے علاوہ اور لوگوں کو بھی اس طریق سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا، ہاں یہ ضرور کہوں گا، کہ ان کو جو اطمینان میسر ہوا، وہ تقلید کی ملاوٹ سے خالی نہیں ہو سکتا، اور یہ کہ اس کو اولیات و ضروریات پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ میرا مقصد تو صرف یہ ہے، کہ اپنے واردات و تاثرات بیان کروں، نہ یہ کہ ان لوگوں کا انکار کروں، جن کو اس انداز سے اطمینان و ایمان کی دولت ملی ہے، اس لئے کہ دوائیں اختلاف امراض سے بدلتی رہتی ہیں۔ مزید برآں کتنی ہی دوائیں ایسی ہیں، جن سے کہ ایک شخص تو صحت و تندرستی حاصل کرتا ہے، اور دوسرا انہیں کے استعمال سے اور بیمار ہو جاتا ہے۔

فلسفہ

اس کا حاصل کیا ہے؟ اس کا کس قدر حصّہ لائق مذمّت ہے اور کس قدر لائق مذمت نہیں، کون فلسفہ موجب تکفیر ہو سکتا ہے، اور کون موجب تکفیر نہیں، اس میں فلاسفہ نے کیا جدّت اختیار کی ہے اور کن کن مقامات میں محض سرقہ سے کام لیا ہے، صحیح و باطل فلسفہ میں حدِ فاصل کیا ہے!

علم الکلام کی بحثوں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے فلسفہ پر اپنی توجہات مرکوز کیں۔ اس کے سرسری مطالعہ سے میں اس یقین تک پہنچا، کہ جب تک کوئی شخص، کسی علم کی غایت و کنہہ کو نہیں پالیتا، وہ اس قابل نہیں ہو پاتا، کہ اس پر تنقید کرے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے، کہ جب تک کسی شخص کا علم، اعلیٰ درجے کے فاضل کا ہم مرتبہ نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس علم و فن میں، اس کا مرتبہ ایسا اونچا نہیں ہوتا، کہ وہ اس کے نشیب و فراز کو کماحقہٗ جاننے لگے، اس وقت تک اس پر نقطہ چینی کرنا مفید نہیں۔

افسوس ہے کہ علماء اسلام میں ایسا کوئی عالم میں نے نہیں دیکھا، جس نے اس علم کے حصول پر پوری پوری توجہ صرف کی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے، کہ متکلمین نے اپنی کتابوں میں، بحث و رد کے سلسلہ میں جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ ایسا پیچ در پیچ، الجھا ہوا، اور صریح متناقض ہے، کہ اس سے عامی و جاہل بھی دھوکہ نہیں کھا سکتا۔ کجا یہ کہ ایسا پڑھا لکھا، آدمی اس سے متاثر ہو سکے، جس کی نظر علم و فن کی باریکیوں اور نکات و دقائق پر ہے۔

فلسفہ کی تحصیل میں، میں اساتذہ کی منت کشی سے آزاد رہا۔

اس امر کے پیش نظر میں نے یہ اچھی طرح جان لیا، کہ بغیر جانے بوجھے کسی مذہب کو ہدف تنقید بنانا ایسا ہی ہے، جیسا کہ کوئی اندھیرے میں تیر چلائے، اس لئے میں نے، اس کے حصول و طلب میں، کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ میں اس گروہ کی کتابیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتا، اور بغیر کسی اُستاد کی مدد کے خود پڑھتا۔ میری مجبوریاں اس باب میں یہ تھیں، کہ بغداد میں کوئی تین سو کے لگ بھگ طلبہ مجھ سے تعلیم حاصل کرتے تھے، اور تدریس کا

کام تصنیف وتالیف کے علاوہ تھا، جو مجھے سرانجام دینا پڑتا تھا۔ ان حالات میں بھی، اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص مہربانی سے دو ہی برس میں متفرق اور فارغ اوقات کے مطالعہ کے ذریعہ میں اس فن کی گہرائیوں سے واقف ہوگیا۔ پھر صرف اس سے متعلقہ کتابوں کے پڑھنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ ان کے مسائل پر برابر غور وفکر کرتا رہا۔ اور سال بھر اس کے استحضار واعادہ میں لگا رہا۔ یہی نہیں، بلکہ اس کی گہرائیوں اور گمراہیوں پر تنقید بھی کرتا رہا۔ اور یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا، کہ اس میں خداع وتلبیس کے اور داؤں پیچ کی مقدار کتنی ہے، اور کتنی مقدار ایسی ہے، جسے تحقیق یا خیال آرائی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس تحقیق وتفحص کے بعد اب آپ فلاسفہ کا حال سنئے، میرے نزدیک یہ گروہ بہت سے گروہوں پر مشتمل ہے، ان کے علوم ومسائل بھی دوسروں سے مختلف اور جُدا جُدا ہیں، تاہم ان میں قدرے مشترک یہ ہے، کہ ان میں کسی کا دامن بھی کفر والحاد کے شوائب سے پاک نہیں۔ ہاں ان میں اقدمین، قدماء، اور متاخرین واوائل کا فرق ضرور پایا جاتا ہے، اور اسی سے ان کے الحاد وزندقہ میں رسوخ کی مقدار متعین ہوتی ہے۔

فلاسفہ کی قسمیں

فلسفیوں کے اگرچہ بہت سے فرقے ہیں، اور متعدد مدارس خیال ہیں، تاہم ان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:۔

(۱) دہریین۔ یہ متقدمین حکماء کا ایک گروہ ہے، جو اللہ تعالےٰ کا منکر ہے، اور جو یہ نہیں تسلیم کرتا، کہ اس کارخانہ کو بنانے اور چلانے والی ذات علم، تدبیر اور قدرت کاملہ سے متصف ہے۔ ان کا یہ گمان ہے، کہ دنیا بغیر کسی صانع کے ہمیشہ سے موجود ہے، اور زندگی کا یہ تسلسل کہ حیوان نطفہ سے ہے، اور نطفہ حیوان کی تخلیق پر اثر انداز ہے، آپ سے آپ جاری ہے۔ ان کی یہ رائے ہے، کہ خلق وتکوین کا یہ سلسلہ ازل سے تا ابد یونہی قائم رہے گا۔ ان کو زنادقہ کے نام سے پکارنا چاہئے۔

(۲) طبعیین۔ یہ اس گروہ سے تعبیر ہے، جنہوں نے عالم طبعیت پر غور وفکر کو مرکوز کیا۔ اور حیوانات ونباتات میں، عجائب وغرائب کی جو ایک دُنیا پنہاں ہے، اس کی نقاب کشائی کی۔ اسی طرح اُنہوں نے تشریح الاعضاء کو اپنا موضوع فکر ٹھہرایا۔ جس سے انہیں اندازہ ہُوا، کہ اللہ تعالےٰ نے، ان میں کس طرح حکمت وصنعت کی باریکیوں کو کھپا رکھا ہے۔ اس غور وفکر نے ان کو مجبور کیا، کہ وہ ایسے خالق وفاطر خدا کو تسلیم کریں، جو ہر شے کی غرض وغایت اور ابتداء وانتہا سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ اور جو کوئی بھی علم تشریح الاعضاء کا مطالعہ کرے گا۔ اور منافع الاعضاء کے عجائب پر نظر ڈالے گا وہ ضرورۃً اسی نتیجہ پر پہنچے گا، کہ جس ذات نے بھی حیوانی ڈھانچہ کو ترتیب دیا ہے وہ تدبیر وحکمت کے کمالات سے بہرہ مند ہے۔

اس طریق فکر سے یہ خدا تک رسائی حاصل کرنے میں تو کامیاب ہوگئے، لیکن چونکہ ان کے غور وخوض کا دائرہ صرف جسم وترکیب لوازم تک محدود رہا۔ اس لئے یہ روح کی حقیقت سے بیگانہ رہے۔ ان کا خیال یہ ہے، کہ جسم کی ترکیب وساخت کو انسانی مزاج کی تخلیق وساخت میں بڑا دخل ہے، اور چونکہ یہ مزاج عقلی، اس جسمانی مزاج کے تابع ہے۔ اس لئے جب یہ کارخانہ درہم برہم ہوگا تو اس کے ساتھ ساتھ مزاج وروح کا رشتہ بھی قائم نہیں رہ سکے گا۔ اس طرح اُنہوں نے آخرت کا انکار کیا۔ اور اس سے متعلقہ حشر ونشر اور ثواب وعذاب کی جملہ کیفیتوں کو محال جانا۔ جس کا انجام یہ ہُوا، کہ اخلاق کی تمام قدریں ان کے نزدیک باطل قرار پائیں۔ یعنی ان کے ہاں نہ

اطاعت موجب ثواب رہی۔ اور نہ معصیت و نافرمانی، باعثِ عذاب۔

اس جماعت کو بھی زنادقہ ہی میں شمار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ایمانیات میں جس طرح ایمان باللہ داخل ہے، اسی طور پر ایمان بالآخرۃ بھی داخل ہے، نہ اس سے انکار ممکن اور نہ اس کے ابطال کی کوئی گنجائش!

(۳) الٰہیین۔ یہ متاخرین حکماء کا گروہ ہے، جیسے سقراط، یہ افلاطون کا استاد ہے، اور افلاطون، ارسطاطالیس کا استاد ہے۔ یہی ارسطاطالیس ہے، جس نے منطق کی داغ بیل ڈالی۔ علوم وفنون کی زلفِ پریشاں کو سنوارا۔ اور ایسے ایسے معارف کو زیبِ قرطاس کیا، جو اب تک ضبطِ تحریر میں نہیں آئے تھے۔ نیز ان علوم کی تکمیل کی، جو اب تک خام چلے آرہے تھے، اور ان کو گوارا اور استوار شکل میں پیش کیا۔

فلاسفہ الٰہیین نے سابق الذکر دونوں گروہوں کو آڑے ہاتھوں لیا، اور اس انداز سے ان کی بُرائیوں کو بیان کیا کہ اور لوگ اس باب میں اب زحمت اٹھانے کی قطعاً ضرورت نہیں رہی۔ گویا:

وکفی اللہ المومنین القتال: اللہ تعالےٰ نے مومنین کو جنگ کی زحمت سے بچالیا۔

ابن سینا اور فارابی، ارسطو کے قابلِ اعتماد شارح ہیں بالخصوص ارسطاطالیس نے تو افلاطون اور سقراط کی وہ خبر لی، کہ کوئی دوسرا کب اس کی جرأت کرسکتا تھا۔ مگر بایں ہمہ اس کی تعلیمات میں بھی کفر والحاد کے اثرات باقی رہ گئے، جن سے یہ دستبردار نہ ہوسکا۔ اس لئے ان کی، اور خود مسلمانوں میں، ان کے لگے بندھوں کی تکفیر واجب ہوئی۔ جیسے ابنِ سینا، اور فارابی، کہ یہ بھی وہی رائے رکھتے ہیں۔ ہاں یہ البتہ ماننا پڑیگا، کہ جس کامیابی اور دیانت سے، ان لوگوں نے ارسطو کے علوم کی ترجمانی کی ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ اور ان کے سوا جن لوگوں نے بھی اس کام کو ہاتھ میں لیا، وہ ان کی طرح، اس سے عہدہ برآ نہیں ہوسکے چنانچہ ان کے ترجموں میں آپ جابجا دیکھئے گا، کہ خاصی تحریف، گڑبڑ اور الجھاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی لکھی ہوئی عبارتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ اور جب یہ حال ہے تو محض ان کے بل بوتے پر ان کی تردید کیونکر ممکن ہے۔ اسی طرح یہ کس طرح ہوسکتا ہے، کہ ان کو جوں کا توں قبول ہی کرلیا جائے۔ بہرحال ان دونوں کی وساطت سے جو فلسفیانہ افکار ہم تک پہنچے ہیں، ان کو تین قسموں میں منقسم کیا جاسکتا ہے:

(۱) وہ قسم جس پر تکفیر واجب ہوجاتی ہے۔ (۲) وہ قسم جسے بدعت سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ (۳) خیالات وافکار کا وہ حصّہ جس کا انکار ضروری نہیں۔ اب اس کی تفصیل سُنئے۔

حکماء وفلاسفہ کے علوم وفنون

ہمارے اس نصب العین کے لحاظ سے، جس کی ہم تلاش میں ہیں، ان لوگوں کے علوم وفنون کی تقسیم یوں ہوگی۔ ریاضیات، منطق، طبیعیات، الٰہیات، سیاسیات اور علم الاخلاق۔

(۱) ریاضیات۔ اس علم کا تعلق صرف حساب وہندسہ یا ہیئت وفلکیات سے ہے، دینیات سے بہرکیف اس کو نفیاً یا اثباتاً کوئی سروکار نہیں! ان کے متعلق یہ کہنا چاہیئے، کہ یہ سراسر امور برہانیہ سے لگاؤ رکھتے ہیں، اور جو کوئی بھی انہیں اچھی طرح جانتا

ہے، ان کی قدر و قیمت اور افادیت کا انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ان کے ذریعے بھی دو طرح کی آفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

آفت اوّل ۔ یہ کہ جو کوئی بھی ان علوم کا مطالعہ کرتا ہے، وہ ان کے دقائق سے متاثر ہوتا ہے، اور یہ دیکھ کر کہ ان میں جن دلائل کو پیش کیا گیا ہے، وہ کس درجہ واضح، اور مستحکم ہیں، متعجب ہوتا ہے۔ پھر معاملہ اگر صرف تحسین و استعجاب تک محدود رہتا تو اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اصلی مصیبت یہ ہے، کہ یہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے کہ ان کے تمام علوم و افکار دلائل کی محکمی و وضوح کے اعتبار سے ایسے ہی پختہ اور ناقابلِ تردید ہیں۔ اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ جب یہ ان کے کافرانہ اور گمراہ کن اقوال کو دوسروں سے سنتا ہے، اور شریعت پر ان کے استہزاء کو ملاحظہ کرتا ہے، تو اس پر سر دھنتا ہے، بلکہ بسا اوقات خود بھی از راہِ تقلید ان کے کفر میں ان کا ہمنوا ہو جاتا ہے۔ یہ استدلال کی کڑیاں کچھ اس طرح ملاتا ہے، کہ اگر دین و مذہب کے انکار و تصوّرات مبنی برحق ہوتے، تو ایسے ایسے حکماء کی نظروں سے کیسے اوجھل رہتے، جنہوں نے کہ تحقیق و تدقیق کی یوں داد دی ہے۔ پھر جب اپنے کانوں سے کفر و انکار کی باتیں سنتا ہے۔ تو پکار اُٹھتا ہے، کہ برسرِ حق دین و مذہب کے افکار و عقائد نہیں، ان کا انکار و تردید ہے۔ چنانچہ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں، جو اس انداز استدلال سے حق و صداقت سے محروم ہو گئے، اور ان کے پاس اس گمراہی پر اس حسنِ ظن کے سوا اور کوئی دلیل موجود نہیں، اور لطف یہ ہے، کہ ان سے ہزار کہا جائے، کہ اگر کوئی شخص ایک علم میں یدِطولیٰ رکھتا ہے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا، کہ دوسرے تمام فنون میں بھی اُس کا پایہ بلند ہے، تو اس سے ان کی تسکین نہیں ہو پاتی، اور از راہِ تقلید جو مان لیا ہے، اس میں کوئی تغیر نہیں رونما ہوتا، بلکہ نفسانیت اور بڑھتی ہے، اور وہ مصر ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کے ساتھ حُسنِ ظن رکھنے میں وہ حق بجانب ہیں۔ حالانکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جو فقہ و کلام میں مہارت رکھتا ہو۔ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ وہ اچھا طبیب معالج بھی ہو، اسی طرح اس میں بھی کوئی منطقی تلازم نہیں کہ جو عقلیات سے ناواقف ہو، وہ بہرحال نحو سے بھی نابلد ہو۔ یہاں صورت حال بالکل مختلف ہے، اور حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ ہر ہر فن کے ماہرین اور ہر ہر علم کے شاہسواروں کا حلقہ الگ الگ ہے۔ لہٰذا یہ عین ممکن ہے، کہ اگر ایک علم کے دائرے میں کسی گروہ یا شخص کی عظمت کا چرچا ہے، تو علم و فن کے دوسرے دائروں میں، اس کے جہل و نادانی کی شہرت ہو۔ دور کیوں جائیے انہیں حکماء کو لیجئے، جہاں ریاضیات میں ان کے استدلالوں کی عمارت دلیل و برہان کی استواریوں پر مبنی ہے، وہاں الٰہیات میں یہ محض تخمین و اندازہ کے بل بوتے پر چلتے ہیں۔ مگر اس فرق کا علم عوام کو ہرگز نہیں ہو سکتا، اس کو تو کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے ان علوم میں گہرے غور و فکر سے کام لیا ہے، اور ان کی جزئیات و فروع کا تجربہ کیا ہے۔

یہ ہے وہ آفت عظیمہ جس سے ریاضیات کے طالب علم دوچار ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس فن کا امورِ دین سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں لیکن ابتدا میں چونکہ ایک طالب علم کو اس وادی سے گذرنا پڑتا ہے، اس لئے اس کے مہلکات سے، اس کو بچانا ضروری ہے تجربہ شاہد ہے کہ ایسے لوگ بہت کم ہیں، جو ان علوم میں پڑیں، اور دین و تقویٰ کے تقاضوں کو مجروح نہ کریں۔

آفت ثانی ۔ ایک مصیبت وہ ہے، جن کا سبب اسلام کے نادان دوست ہوتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں، کہ اسلامی عقائد و افکار کی تائید و نصرت کے لئے ضروری ہے۔ کہ ان لوگوں کے تمام علوم و معارف کا انکار کیا جائے، اور یہ نہ تسلیم کیا جائے۔ کہ ان کے دامنِ علم میں

کوئی سچائی پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ امور جن کا تعلق ٹھیک ٹھیک حساب و ریاضی سے ہے، جیسے کسوف و خسوف کی تعیین وغیرہ، تو اُس کو بھی جھٹلایا، اور خلافِ شرع قرار دیا جس کا نتیجہ یہ ہؤا، کہ جب عوام کو معلوم ہؤا کہ اس باب میں حکماء کا قیاس، محکم اور مضبوط دلائل پر مبنی ہے، تو انہوں نے اس میں تو کسی شک و شبہ کا اظہار نہ کیا۔ البتہ یہ ضرور جان لیا، کہ اسلام کی بنیاد ہی جہل پر ہے، اور ایمانیات کا سارا کارخانہ ہی دلیل و برہان کی تکذیب پر قائم ہے۔ اس طرح فلسفہ اور امور عقلیہ سے ان کا شغف اور بڑھا، اور اسلام کی عداوت و بغض کا جذبہ دل میں بُری طرح جم گیا۔ یہ طرزِ عمل اور یہ اندازِ فکر اختیار کر کے، اسلام کے ان نادان دوستوں نے حقیقت یہ ہے کہ بہت بڑا ظلم ڈھایا ہے۔ کیونکہ جہاں تک اسلامی تعلیمات کا تعلق ہے نفیاً یا اثباتاً اس میں بالکل ان علوم و فنون سے تعرض نہیں کیا گیا۔ اور آنحضرت نے یہ جو فرمایا ہے:

ان الشمس والقمر آیتان من آیات اللہ لا ینخسفان لموت احد ولا لحیاتہ۔

کہ سورج اور چاند اللہ کے نشانوں میں سے دو نشان ہیں، ان کا کسوف خسوف کسی کی موت و زندگی سے وابستہ نہیں۔

تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ہرگز صحیح صحیح حساب و ریاضی کے مقتضیات کو جھٹلانے والا نہیں۔ کسوف و خسوف کی ایک توجیہ احادیث میں یوں بھی آئی ہے:

لکن اللہ اذا تجلی لشئی خضع لہ۔

اللہ جب کسی چیز کو اپنا روئے زیبا دکھاتا ہے تو وہ چیز اس کے سامنے جُھک جاتی ہے

مگر اس توجیہ سے متعلق یہ جان لینا کافی ہے، کہ کتب صحاح میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔

افکارِ غزالی

مصنفہ مولانا محمد حنیف ندوی۔ اس میں یہ کوشش کی گئی ہے۔ کہ "احیاء العلوم" کی مختصر مگر مستند تلخیص پیش کی جائے۔ جس میں غزالی کے تمام علمی و اصلاحی افکار کی جھلک موجود ہو۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ علم اور اس کے حدود کیا ہیں؟ علماء حق یا طالبانِ آخرت اور علماءِ سوء، یا شیفتگانِ رذائل دنیا میں کیا فرق ہے؟ زندگی کے فقہی انداز میں کیا قباحتیں ہیں؟ مناظرہ و جدل کیوں ناجائز ہے؟ ریاء کیا ہے؟ اخلاص کس سے تعبیر ہے؟ اصلاح باطن کیوں ضروری ہے؟ ظاہر و معنی میں کیا ربط ہے؟ اور کہاں کہاں؟ ہم مجبور ہیں کہ الفاظ و ظواہر کے اقتضاء کو چھوڑ کر مغز و معنی اور روح و اصل کی طرف رجوع کریں۔ اس ڈھنگ کی بیسیوں عارفانہ بحثیں ہیں جو اس کتاب کی وسعتوں میں سمٹ آئی ہیں۔ قیمت پانچ روپے

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ ۲۔ کلب روڈ۔ لاہور (پاکستان)